# حضرت مولانا ہاشمی، بطور ایک صوفی باصفا

جناب احمد جاوید صاحب۔ اقبال اکیڈمی پاکستان،
ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

## نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ہمارے قبلہ ہاشمی صاحب علیہ الرحمہ واقعی عجیب آدمی تھے۔ مجھے بہت تھوڑے وقت کیلئے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا لیکن ان کے ظاہر و باطن میں ایسی مستقل یکرنگی تھی کہ پوری شخصیت پہلی ہی نظر میں صاف پانی کے چشمے کی طرح کسی چھاؤں کے بغیر سامنے آجاتی تھی۔ نفسیات والے تو یہ بات نہیں مانیں گے کیونکہ وہ انسان کو نفس کی تاریکی سے باہر لاکر دیکھ ہی نہیں سکتے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ انسانی شخصیت کی حتمی تشکیل اس کے وجود کی دو سطحوں میں سے کسی ایک سے ہوتی ہے۔ "نفس یا روح" انہی دو بنیادوں پر انسان اپنا مجموعی تشخص استوار کرتا ہے۔ نفس کا اصول چونکہ کثرت ہے لہذا اس کی کارفرمائی کے نتیجے میں شخصیت کے اندر چیزوں کو ان کی نسبت حقیقی سے جو واحد الاصل ہو، کاٹ کر محض ظواہر کی جہت سے دیکھنے کی عادت پیدا ہوجاتی ہے۔۔۔۔ اور ظواہر میں محدود رہنے کی یہ خو فقط خارجی متعلقات ہی پر اثرانداز نہیں ہوتی بلکہ پوری شخصیت کو خانوں میں بانٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے برعکس روح کا اصول وحدت ہے یعنی واحد گفتن و واحد دیدن و واحد بودن ۔ جو مردان خدا اس دائرے کے مرکز میں زیست کرتے ہیں، اپنے تمام تر نفسی و آفاقی پھیلاؤ میں ان کی ہستی کا گوشہ گوشہ اس نور وحدت سے روشن ہوتا ہے جو نفس کے وارد کردہ بکھراؤ اور اس کے نتیجے میں انسانی شعور و عمل کی ہر سطح پر مسلط تاریکی کا خاتمہ کردیتا ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ راز کھلتا ہے کہ صورت دراصل معنی کا اور ظاہر باطن ہی کا ظہور ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح صورت و معنی اور ظاہر میں عینیت کی نسبت نہیں پیدا ہوتی بلکہ تمام

مراتب وجود کے درمیان کارفرما اس نظام استناد کا اثبات ہوتا ہے جو ہر مرتبے کو اپنے سے اوپر کے مراتب کے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔ یہاں تفصیل کا محل نہیں، ممکن ہے آگے چل کر ہاشمی صاحب کی متصوفانہ زندگی کے حوالے سے اس بات کو آگے بڑھانے کا موقعہ نکل آئے۔ ابھی تو ان کی شخصیت کا ایک بنیادی وصف بیان کرنا مطلوب تھا کہ خدا کے فضل سے ان کے اندر ایسا کوئی پیچ نہیں تھا جو کسی نفسیاتی تجزیئے کا متقاضی ہوتا۔ ہر پہلو سے ایک دم سادہ آدمی تھے۔ ان سے ملنےوالا کوئی بھی شخص ان کے بارے میں تجسس محسوس نہیں کرتا تھا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ سادگی میں جو گہرائی ہوتی ہے اس میں اترنا ہر کسی کا کام نہیں۔ کم ازکم اپنی حد تک تو کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے پاس بیٹھ کر مجھے ہمیشہ ایک مکمل اظہار کا احساس ہوا جسے یہ تو ہوسکتا ہے کہ میں اپنی گرفت میں نہ لے سکا ہوں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کے ارد گرد کوئی دھندلکا سا محسوس ہوا ہو۔ بہت کم لوگ اتنی شفاف شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔

مولانا کے بے شمار اوصاف میں سے اس وصف کو آغاز میں بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ اسکے حوالے سے اس طریقِ تصوف کے تعارف میں بھی مدد مل جائے گی جس سے وہ منسلک تھے۔

اپنے زمانۂ طالب علمی میں مولانا کو دارالعلوم دیو بند میں ان فخر روزگار ہستیوں سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا جن میں ہر ایک صاحب حال و مقام صوفی تھا۔ بعض خاص مناسبتوں کی وجہ سے ان کے دل میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ سے بیعت ہونے کا داعیہ پیدا ہوا۔ حضرت شیخ سے عرض کیا تو آنجناب نے یہ کہکر ہنسی میں اڑادیا کہ بھاگ جاؤ! تم لوگوں کے قول و فعل کا کیا اعتبار--- اس ظریفانہ انکار سے ہاشمی صاحب فوری طور پر تو بس اتنا سمجھے کہ قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے سلسلے میں طالب علموں کو مرید کرنا اچھا نہیں جانا جاتا اسی لیئے حضرت اقدس نے ٹال دیا، مگر ایک مدت بعد جب قدرت نے انہیں شاہ عبد الرحیم صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچایا تب معلوم ہوا کہ میرے حصے کا فیض تو یہاں لکھا تھا! حضرت مدنی رحمہ اللہ نے یہی دیکھ کر انکار فرمایا تھا-- شاہ عبدالرحیم نقشبندی بزرگ تھے اور اویس زمانہ حضرت مولانا شاہ

فضل رحمن صاحب گنج مراد آبادی قدس سرہ العزیز کے خلفاء میں سے تھے۔ نقشبندیہ نسبت چونکہ انعکاسی ہے لہذا وہاں مبتدی اور متوسط کےلئے حضور فیض کا سب سے بڑا ذریعہ صحبتِ شیخ ہے۔ اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ اس لئے ان حضرات کا یہ معمول ہے کہ شیخ دور دراز جگہوں پر رہنے والے مریدوں کو اپنے خلفاء کے سپرد کردیتا ہے تا کہ صحبت سے محروم نہ رہیں اور آگے بڑھنے کے لئے توجہات لیتے رہیں۔ اس سلسلۂ عالیہ میں شیخ کی تین قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ شیخِ بیعت، شیخِ صحبت و توجہ اور شیخ تعلیم۔ پاس کے مریدوں کیلئے شیخِ بیعت ہی شیخِ صحبت و تعلیم ہوتا ہے مگر دور ماندوں کیلئے اس کی طرف سے یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ طالب اس کے کسی نمائندے کی صحبت اختیار کرے توجہات سے بہرہ مند ہو کر روحانی ترقی کے مدارج طے کرے اور اپنے طریق کی علمی جہت سے بھی شناسائی پیدا کرے۔ یوں بالعموم تعلیم کی ذمہ داری بھی شیخِ صحبت ہی پر ہوتی ہے۔ اس طرح اکثر نقشبندی سالک عملاً دو پیروں کے مرید ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ نے بھی اسی روایت پر عمل فرمایا اور ہمارے ممدوح کو اپنے ایک محبوب خلیفہ مولوی محمد فاروق صاحب وکیل کے سپرد کردیا۔ وکیل صاحب مولانا کے ہم وطن بھی تھے۔ اس بہانے نسبت کا مکانی پہلو بھی خالی نہ رہا۔ قبلہ وکیل صاحب بزرگوں کی اس قبیل سے تعلق رکھتے تھے جن پر فنا و ملامت کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہاں فنا کا تو کم و بیش وہی مفہوم ہے جو تمام سلاسل میں مروج ہے مگر ملامت کو اس معنی میں نہیں لینا چاہیے جو عام طور پر مشہور ہے۔ ذکر چونکہ ایک نقشبندی بزرگ کا ہورہا ہے لہذا اس اصطلاح سے مطلب بھی وہی اخذ کرنا ہوگا جو نقشبندیوں سے خاص ہے: یعنی سارے مکروہات و ممنوعات سے دور رہتے ہوئے تمام فضائل پر ایسے اخفائے حال کے ساتھ عمل کرنا کہ لوگ سب کچھ دیکھنے کے باوجود بزرگی کا حکم نہ لگا سکیں--- یہ عین صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا رنگ ہے۔ فنا ہو یا ملامت، نفس کا سر کچلے بغیر نہ یہ ہاتھ آتی ہے نہ وہ۔ وکیل صاحب کے ہاں سارا زور اسی چیز پر تھا۔ وہ نفس کو سر ابھارنے کا ذرا سا موقع دینے کے بھی روادار نہ تھے۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالی کے مذاق مبارک کی پیروی میں مباحات کے دائرے کو بھی تنگ سے تنگ تر رکھنے کے درپے رہتے تھے۔ اپنے لئے بھی اور اپنے متوسلین کےلئے بھی۔ خیر سے کشف میں بھی اپنے بزرگوں کی نظیر

تھے۔ سامنے کی کوتاہیوں پر تو ظاہر ہے ٹوکتے ہی تھے، آنکھ اوجھل لغزشوں کا بھی کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ ہاشمی صاحب کی طبیعت کچھ ناساز تھی، اوپر سے سخت گرمی بھی پڑ رہی تھی۔ بے چینی نے زور کیا، کرتا بدن سے الگ کر کے تھوڑی ہوا لینے اپنے دو منزلہ گھر کی چھت پر جا پہنچے اور وہیں فرش کر کے لیٹ رہے۔ اتنے میں مغرب کی آذان ہو گئی۔ نیچے آنے کی طاقت کہاں تھی۔ بنیان اور تہبند ہی میں نماز پڑھ لی اور پھر دراز ہو گئے ۔ دوسرے دن حسب معمول وکیل صاحب کی طرف پہنچے تو چھوٹتے ہی پکڑ ہو گئی کہ میاں بڑے عالم بنتے ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ کرتا اتار کر محض بنیان میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ مولانا نے ہاتھ جوڑ دیئے کہ حضرت! بڑا کمزور آدمی ہوں، اتنی سخت نگرانی نہ کیا کریں-- یہ واقعہ ان کے انداز تربیت کا فقط ایک نمونہ ہے ورنہ ایسے قصے تو وہاں روز ہی ہوا کرتے تھے۔ ایسے مربی کے ساتھ نباہ کرنا لوہے کے چنے چبانا تھا۔ ہمارے ہاشمی صاحب نے ان کی خدمت میں برس دو برس نہیں ایک زندگی گزار دی۔ پھر لطف یہ کہ قبلہ وکیل صاحب اصلاحی معنوں میں کوئی عالم نہ تھے۔ جبکہ مولانا ماشاء اللہ عالم اسلام کے سب سے مستند دارالعلوم سے فارغ التحصیل تھے۔ اور اپنے ساتھ کے علماء میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود میں نے بارہا خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب کبھی وکیل صاحب کا تذکرہ چھیڑتے تو بالکل بچوں کی طرح حیرت، فخر اور خوشی سے شرابور ہو جاتے اور یہ مشاہدہ بھی کوئی بہت پہلے کا نہیں بلکہ پچھلے دو چار سال کا ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی مصاحبت میں اس عالم بے بدل اور خطیب بے مثل کا کیا رنگ ہوتا ہوگا۔

مولانا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وکیل صاحب محمد فاروق صاحب قبلہ کی تربیت و توجہ کی برکت سے نفس میں ایک مستقل ذلت کی حالت پیدا ہو گئی۔ نہ دشنام کا اثر ہوتا نہ واہ واہ کا۔ وہ تو خیر یہ بات بہت شرماتے ہوئے اور بالکل عام سے انداز میں بتاتے تھے۔ لیکن بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ حال سلوک کے منتہیوں میں بھی کمیاب ہوتا ہے۔ نفس کی سب آفتیں مرکھپ کے زائل کی جاسکتی ہیں۔ مگر تکبر کا علاج انتہائی مشکل ہے۔ ایک راستہ بند کرو تو سو اور کھل جاتے ہیں اور پھر اس کے اظہار کی کوئی ایک صورت بھی نہیں کہ آدمی اسی کو نظر میں رکھ کر لگا رہے۔ بعض اوقات حد درجہ تذلل و انکسار کے پردے میں بھی اسی کی

کارفرمائی ہوتی ہے۔ بس اللہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ مولانا کی خوش نصیبی تھی کہ وہ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی اس شاخ میں بیعت ہوئے جسے مجددِ طریق حضرت شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی قدس اللہ اسرار ہم کی نسبت سے یہ خصوصی امتیاز حاصل تھا کہ وہاں ایک طرف تو تفصیل سے نفس کا تزکیہ کروایا جاتا تھا اور دوسرے طرف حب عشقی کا فیضان کیا جاتا تھا۔ یہ ایک اجتماع ہے۔ تزکیۂ نفس سلوک و نزول کا موضوع ہے جبکہ حب عشقی جذب و عروج سے متعلق ہے۔ ان دونوں کو ساتھ ساتھ چلانے کیلئے انتہائی جامعیت درکار ہے۔ عام طور پر تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں نفس کے تفصیلی تزکیئے پر زور ہوتا ہے وہاں جذب و عروج کی جہت ناقص رہ جاتی ہے اور جس طریق میں نفس کی باریک چالوں سے الجھنے کی بجائے جامعیت عشقی کا غلبہ ہوتا ہے وہاں سلوک و نزول میں کسی قدر خلا ضرور رہ جاتا ہے۔

صوفیہ کے نزدیک تعلق مع الحق کے تین اصول ہیں۔ محبت، خشیت اور معرفت۔ مبتدی کیلئے یہ تین راستے ہیں، متوسط کیلئے تین منزلیں اور منتہی کیلئے ایک مثلث کے تین زاویے۔ کامل وہی ہے جس نے ان کے حقیقی توازن کو پالیا۔ البتہ ظہور میں ممکن ہے کہ کوئی ایک باقی دونوں پر غالب آجائے کیونکہ خارج میں ترکیب اپنے اجزاء کی حقیقی مساوات سمیت ظاہر نہی ہوسکتی۔ حضرت شاہ فضل رحمن کاملین کی اسی جماعت کے فرد فرید تھے جن کیلئے مشاہدۂ حق کے یہ تینوں روزن کھل جاتے ہیں۔ ظاہر میں وہاں محبت کی وصالی جہت کا غلبہ تھا۔ ہمہ وقت مستی و سرشاری کی حالت میں رہتے تھے۔ خدا نے ظاہری علم بھی کمال کا عطا فرمایا تھا۔ تفسیر وفقہ کے ماہر اور حدیث کے متخصص تھے۔ مگر یہ علم حافظے کی تیزی اور ذہانت کی چمک دمک کا مرہون نہیں بلکہ اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کے ساتھ ان کے زندہ تعلق سے عبارت تھا۔ کسی آیت کو کھولنے بیٹھتے تو سننے والا صاف محسوس کرتا کہ اس کے اور خدا کے درمیان ایک پل سا بنتا جارہا ہے، کوئی فقہی مسئلہ بیان کرنا شروع کرتے تو حاضرین حضور فی الاحکام کی شدید کیفیت میں ڈوب جاتے اور حدیث کا درس جو دن میں دو دو تین تین بار ہوا کرتا تھا، دیتے تو رسول اللہ ﷺ کی محبوبیت کے حقائق روح میں جھماکا کرتے ہوئے نس نس میں چنگاریاں بھر دیتے۔ ان کا کل تصور یہی تھا کہ قرآن سے جی لگاؤ اور حدیث کے متوالے بنو باقی چیزیں غیر ضروری ہیں۔ اسی لئے تصوف کی کتابوں کا مطالعہ ناپسند کرتے

تھے۔ اس میں غالباً بھید یہ تھا کہ ایک خاص نوع کی متصوفانہ کتابیں جن میں دقیق عارفانہ مضامین یا عجیب و غریب اعمال و اشغال کا بیان ہوتا ہے۔ سالک کیلئے مستقل حجاب بن جاتی ہیں۔

ٹھیٹھ معارف کا اظہار خواہ وہ کسی نے بھی کیا ہو، پوری تاریخ تصوف میں ایک لمحے کیلئے بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ ہاں وہ حضرات اس تعمیم سے مستثنیٰ ہیں جنہوں نے اپنے معارف کا بیان ان اصطلاحات میں کیا جو ہمارے فکر و تخیل یا شعور روحانی کی تہ میں اپنے پورے معنوی نظام کے ساتھ موجود چلی آرہی ہیں۔ ان کی مجموعی فضا میں ہم عرفاء کے کلام کو ذہن کی اس من چاہی تفہیم کی زد سے دور رکھنے پر قادر ہوجاتے ہیں جو لفظ و معنی کی باہمی نسبت میں تغیر در تغیر پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح صورتوں کا ایک ڈھیر تو تیار ہوجاتا ہے مگر معنی غائب ہوجاتے ہیں کیونکہ تغیر معنی کا نہیں، صورت کا اصول ہے۔ جو لوگ عارفانہ کتابیں پڑھ پڑھ کے صاحب معرفت بننے کے خبط میں مبتلا ہوتے ہیں انہیں غالباً اس قاعدہ کلیہ کے الف بے کی بھی خبر نہیں کہ اس راہ میں پہلا قدم علم نہیں ارادے کی جہت سے اٹھایا جاتا ہے اور اس کی پہلی منزل معلوم کا نہیں بلکہ مراد کا حصول ہے۔ معرفت کا بیج علم سے نہیں ارادے سے پھوٹتا ہے ورنہ بصورت دیگر عبودیت کا ذوق مرجھا کے رہ جائے گا۔ اس نکتے کی تفصیل کرنے بیٹھیں تو ماشاء اللہ اسے پورا دفتر چاہیے۔ اس کی فرصت ہے نہ صلاحیت۔ اجمال کی قید لگا کر کچھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ معرفت حق کے بہرحال دو پہلو ہوتے ہیں۔ حضور علمی اور حضور عینی۔ حضور علمی ذات سے اک گونہ تعلق رکھنے کی وجہ سے گو کہ ایک اصولی فضیلت رکھتا ہے مگر اعتبار پر مبنی ہونے کی بدولت اس میں تعلق مع الحق کیلئے لازمی طور پر درکار وہ ایمانی ٹھوس پن، موجود نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر حقائق آدمی کے وجود کی تمام سطحوں پر ایک مفید یقین حتمیت کے ساتھ منکشف ہوتے ہیں۔ اور یہی حضور عینی ہے جس کا معمول ارادہ ہے۔

دشواری یہ ہے کہ ہماری زبان چونکہ تہذیبی ضروریات سے پیدا ہوئی ہے لہذا اس میں عرفانی مضامین کے بیان کی سہار نہ ہونے کے برابر ہے۔ بات یا تو مشکل ہوجاتی ہے یا اتنی سادہ کہ موضوع کی دقت و رفعت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ورنہ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ کتابیں چاٹ کر اللہ کو نہیں جانا جاسکتا۔ اللہ سے محبت کرو، اس سے ڈرو، اس کے حکموں کو

پوری کوشش کرکے سمجھو اور ان پر پورا پورا عمل کرو، اسے ہر آن یاد رکھو۔۔۔ اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کے حبیب ﷺ کی محبت واطاعت میں جیومرو۔ بندے کو معرفت کا ہر درجہ بس انہیں ہدایات پر چل کر حاصل ہوسکتا ہے۔ دیکھیں ان سب باتوں کا مخاطب ارادے کو بنایا گیا ہے کیونکہ حقیقتِ عبدیت کا حصول اس کی مستقل کار فرمائی کے بغیر محال ہے اور کوئی معرفت اس معرفت سے بڑھ کر نہیں کیونکہ یہ اپنی دونوں طرفوں یعنی معبودیت جو طرف اعلیٰ ہے اور عبدیت جو طرف ادنی ہے، کا احاطہ کرکے ان پر اور ان کے درمیان پائی جانے والی تمام مستقل ومتغیر نسبتوں پر یقین کا حکم لگاتی ہے۔ خیر! تذکرہ ہو رہا تھا حضرت شاہ فضل رحمن رحمہ اللہ کا کہ وہ تصوف کی کوئی کتاب نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا تصوف ہمارا دل ہے۔ دل یہاں ظاہر ہے کہ اسی معنی میں آیا ہے جو صوفیہ میں عام طور پر مروج ہے تاہم حضرت کی نقشبندی نسبت کے حوالے سے اس میں ایک اور بات بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ حضرات نقشبندیہ رحمہم اللہ اجمعین کے ہاں دل اللہ تبارک وتعالی کی صفات فعلیہ کی تجلی گاہ ہے اور یہ امر محتاج وضاحت نہیں کہ صفات فعلیہ کی نسبت بھی ارادے کی ساتھ ہے اور ارادے کا مصدر قلب ہی ہے۔ شاید اسی لئے آنجناب اپنے مریدوں کو فقط قلب کی طرف متوجہ رکھتے تھے، نقشبندی طریقے کے کلاسیکی معمول کے مطابق دیگر لطائف کا اجراء وہاں شاذ تھا۔ مراقبات میں سے بھی صرف معیت اور محبت کا مراقبہ تعلیم فرماتے تھے۔ اسباق کی رسمی ترتیب و تفصیل سے سروکار نہ تھا، دل کی زمین میں شعلہ کاشت کرتے تھے۔ پہلا سبق بھی عشق تھا اور آخری سبق بھی عشق۔

روح پدرم شادچہ خوش گفت باستاد
فرزند مرا عشق بیاموزود گر ہیچ

بڑوں نے بتایا ہے کہ عشق و خشیت کا ایسا اجتماع جسمیں ایک دوسرے سے مغلوب نہ ہو، نایاب نہیں تو انتہائی نادر یقیناً ہے۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے وہاں یہ دونوں مساویانہ جمع تھے۔ یہ وصف فنائے نفس بلکہ اس کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کمال اس وقت میسر آتا ہے جب نفس کا آخری حجاب یعنی صورت بھی رفع ہوجائے۔ لیکن چونکہ عالم خلق میں صورت ہی سے کام ہے اور نفس کی یکسر نابودی بھی مطلوب نہیں کہ تعبدی امور کی

انجماد ہی لایعنی ہو کر نہ رہ جائے، لہذا اللہ تعالی نے اپنے رسول مکرم ﷺ کے اسوہ کاملہ کی شکل میں تعلق مع الحق کے صورو اوضاع ہمیشہ کیلئے محفوظ فرما دیئے جن میں کسی طرح کے تغیر کو راہ نہیں۔ یوں نفس کو اس کے مدار یعنی صورت سے کامل طور پر ہٹانے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ محض نس اس کی بے مہار تغیر اندازی کو لگام دے کر ایک خاص حد تک محدود رکھنے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہاں حضرت کے بے مثال اتباع سنت کی ایک نئی معنویت سامنے آتی ہے۔

غرضیکہ آنجناب کی شخصیت نے سلسلہ نقشبندیہ کی اس شاخ کو کئی اعتبار سے امتیازی حیثیت بخشی۔ آپ کی روحانی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ آپ کے شجرۂ طریق کی کئی پیڑھیاں فرق مراتب کے ساتھ آپ ہی کے رنگ سے رنگین رہیں۔ مجھے اس خانوادے کے اور تو کسی بزرگ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، ایک ہاشمی صاحب قبلہ کو دیکھنے کا شرف ضرور حاصل ہوا، اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ انہیں دیکھ کر شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی رحمہ اللہ کا خیال نہ آیا ہو۔ ان کے تمام محاسن اپنے شیخ الشیخ رحمہ اللہ کی نسبت کا حسن بھی رکھتے تھے بلکہ اگر دونوں حضرات میں مساوات کا وہم نہ پیدا ہو تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیئے کہ مولانا کے تقریباً تمام رنگ شاہ فضل رحمن علیہ الرحمہ سے بہت زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔ مثلاً وہی عاشقانہ سوز و گداز، وہی فیاضی، وہی کشف و شہود حتی کہ لہجے کی ظاہری تیزی اور دنیاوی معاملات میں بچوں کی سی معصومیت بھی وہی تھی۔

جیسا کہ اوپر کہیں مذکور ہوا کہ طریق میں داخل ہوتے ہی مولانا کو ایسا انداز تربیت میسر آیا جس میں نفس کی سرکوبی کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی۔ نقشبندی سلسلے کے تناظر میں ان کی متصوفانہ حیثیت کا مطالعہ کرنے کیلئے یہ بات نظر میں رہنی چاہیے۔ اس سلسلہ عالیہ میں جذب، سلوک پر مقدم ہے یعنی یہاں حضور حق پہلے ہے، اصلاح نفس بعد میں۔ حضرات نقشبندیہ قدس اللہ تعالی اسرار ہم کا طریقہ یہ ہے کہ اوّل روح میں جاذبۂ الٰہیہ کی اس قبولیت کو از سر نو بیدار کر دیتے ہیں جو جسدی تعین کے شرائط کے زیر اثر کند ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ روح یا زیادہ تکنیکی انداز میں بیان کیا جائے تو عالم امر کے لطائف اپنی اپنی اصل سے واصل ہو کر دوامِ حضور یعنی فطرت اصلی کی اس حالت سے جس میں حق کے لازمانی و لامکانی

ظہور کو محسوس کرنے کی اصولی استعداد موجود تھی، مشرف ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد نفس یا عالم خلق کے لطائف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہاں بھی دیگر بابرکت طریقوں کے برعکس نفس کو کرید کرید کر اس کی اصلاح کرنے یا ہر قدم پر اسے ذلیل کرنے کی بجائے منطق کی اصطلاح میں اس کو ایک نیا موضوع فراہم کردیا جاتا ہے اور اس کے خلقی نظام تعلق جو صورت کے اصول پر قائم ہے، منہدم کرنے کی کوشش کیئے بغیر اسے حق کی شدید الظہور صورتوں کے ٹھوس تجربے سے گزارا جاتا ہے۔ گویا اس طریق میں نفس کو حاضر کیا جاتا ہے نہ کہ غائب۔ تاہم بعض مصلحتوں کی وجہ سے بعض مجددینِ طریق حضرت امام ربانی قدس سرہ العزیز کے بعد بھی اسباقِ سلوک میں کمی بیشی کرتے رہے۔ مثلاً خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ روایتی تربیت کو نظر انداز کر کے قلب کے فوراً بعد نفس کا سبق دیا کرتے تھے حالانکہ قلب پہلا سبق ہے اور نفس چھٹا۔۔۔۔۔۔ حضرت میرزا مظہر جانجاناں علیہ الرحمہ نے اسباق نقشبندیہ میں تہلیل لسانی کا اضافہ کیا، بعض مشائخ نے پاس انفاس کو رائج کیا اور اسی روایت پر چلتے ہوئے شاہ فضل رحمن علیہ الرحمہ نے مراقبات کو معیت اور محبت کی دو شقوں میں مرتکز کر کے لطائف میں سے صرف قلب وروح کو باقی رکھا۔ کوئی ٹھکانہ ہے اس فراست کا کہ طالب علموں کی کم استعدادی اور بے ہمتی کا ادراک کرتے ہوئے تفصیل کو ترک کر کے محض ایک اجمالی نسبت کے فیضان پر قانع ہو گئے لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ان پر یہ راستہ عملاً بند ہو جائے۔ حضرت کے ہاں منتہائے حصول یہ تھا کہ سالک عشق اور عبدیت کو جامع ہوجائے۔ نسبت عشق کے حصول کے واسطے تصفیہ قلب وروح کو اور عبدیت کی حقیقت کو پانے کیلئے تزکیہ نفس کو کافی جانا۔ تاہم نفس کی اصلاح کیلئے ایسے ضابطے وضع نہیں فرمائے جن میں مرید، مریض اور شیخ، معالج ہوتا ہے۔ بس نفس میں تذلل کا احساس پیدا کرتے تھے خواہ کسی طریقے سے ہو۔ خیر آپ کی خانقاہ کی تو فضا ہی ایسی نفس شکن تھی کہ اس میں داخل ہوتے ہی بڑے سے بڑا طرم خان ساری ہیکڑی بھول کر سر نیہوڑا دیتا تھا۔ ظاہر ہے یہ بات آپ ہی سے خاص تھی، بعد میں آنے والوں کو اس ضمن میں کچھ نیم ضابطے سے مقرر کرنے پڑے مثلاً تقلیلِ طعام ومنام وغیرہ۔ جن اصحاب کو طریق میں قبلہ ہاشمی صاحب سے وابستگی کی سعادت حاصل رہی ہے وہ انشاءاللہ میری بات کی تصدیق کریں گے کہ ان کی پوری شخصیت انہی دو

چیزوں سے مرکب تھی جنہیں انکے دادا پیر اپنے متوسلین کے واسطے مقصود ٹھہرا گئے تھے، یعنی عشق اور بندگی۔ ان کا زور اس قدر تھا کہ ضبط احوال کے انتہائی اہتمام کے باوجود مجھ جیسوں کو بھی کبھی کبھی محسوس ہوجایا کرتا تھا کہ ان کا خمیر آگ اور آنسوؤں سے گوندھا گیا ہے۔

محمد حسین آزاد نے کسی جگہ میر اور سودا کے کلام کا جوہری فرق بتایا ہے کہ میر کا کلام آہ ہے تو سودا کا واہ۔ مجھے تو کچھ یوں سوجھتا ہے کہ ہمارے مولانا کا عشق واہ تھا اور بندگی آہ۔ واہ عشق کی اس وصالی جہت سے عبارت ہے جس میں بندگی فراموش نہیں ہوتی اور آہ بندگی کی وہ سطح ہے جہاں عین حضور معبود میں بھی اپنا حقیقی تعین مستحضر رہتا ہے اور دل کی ناصبوری کے باجود اپنی اٹل نارسائی پر صابر و شاکر رہنا پڑتا ہے۔ گویا واہ بندے کی عاشقی ہے اور آہ عاشق کی بندگی۔

یہ بات محض عبارت آرائی نہیں ہے۔ لوگوں نے کئی مواقع پر اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا ہے۔ کم از کم دو واقعے تو اب بھی میرے حافظے میں تازہ ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ مولانا اپنی اولاد پر جان چھڑکتے تھے۔ خاص کر اپنے چھوٹے بیٹے ہلال محمد ہاشمی کو تو جان سے لگائے رکھتے تھے۔ خود اس عزیز کا بھی یہی معاملہ تھا کہ کل چودہ سال کی زندگی میں ایسی خرق عادت ذہانت اور ششدر کردینے والا حافظہ دکھا گیا کہ اگر جیتا رہتا تو عین ممکن تھا کہ جدھر کا ارادہ کرتا سب سے آگے ہوتا۔ ایسے فرزند کی موت پر جو بیتنی چاہیے تھی سو ان پر بھی بیتی۔ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے مگر اللہ اکبر! اس ٹوٹنے پر بھی رب سے جڑے رہے۔ لگتا تھا کہ بیٹے نے مر کر باپ کو خدا سے اور نزدیک کردیا ہے۔ دوسرا واقعہ بڑے صاحبزادے سراج منیر کی جوانمرگی کا ہے۔ سراج منیر مولانا کی تمام ذہنی، قلبی اور روحانی آرزوؤں کا محور و مرکز تھے۔ میں اپنی حد تک تو قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے معاملات میں وہ دوسرے اقبال تھے۔ وہی بصیرت، وہی گہرائی، وہی پیش بینی، وہی ہمہ گیر علمیت اور وہی خلاقانہ ذہانت، وہی تڑپ، وہی دردمندی، وہی رجائیت اور وہی امت مسلمہ کے لئے جان گھلا دینے والی کیفیت۔ حافظہ علامہ انور شاہ کشمیری کا لے کر آئے تھے۔ جن علوم و فنون پر مرحوم دسترس رکھتے تھے، اپنی معلومات کے مطابق ان کی فہرست ذیل میں پیش کیئے دیتا ہوں۔ خود ہی دیکھ لیں

ایسی وسعت و جامعیت اس زمانے کا تو خیر ذکر ہی کیا، اگلے وقتوں میں بھی کتنوں کو نصیب ہوئی ہے۔

تو بسم اللہ! ملاحظہ ہو:۔

مابعد الطبعیات، کلام، تصوف، تاریخ، فلسفہ تاریخ، دنیا کی بیشتر زبانوں کا ادب یعنی شاعری، تنقید، نثر، عالمی مصوری کی تاریخ، فلسفہ، اصول تہذیب، تقابل ادیان، طب یونانی، نفسیات، ہومیوپیتھی، بایو کیمک، دست شناسی، نجوم سیاسیات، اقتصادیات، علم الاعداد، نظری سائنس، جمالیات وغیرہم۔

میں نے زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا ورنہ ان میں اکثر کا یہ حال ہے کہ ایک ایک علم کئی کئی علوم کو محیط ہے۔

ایک دو ہوں تو سحر چشم کہوں
کارخانہ ہے واں تو جادو کا

اور یہ سارے کمالات کوئی عمر خضر لگا کر نہیں بلکہ فقط انتالیس برس کی حیات میں حاصل کرلیئے تھے۔ ابھی چالیس کو نہیں پہنچے تھے کہ بلاوا آگیا۔ کسی آدمی کے دس جوان بیٹے ہوں اور وہ اکٹھے مرجائیں۔ کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے غم کا؟ مولانا کا غم شاید اس سے بھی زیادہ تھا۔ سوئم کے دن قرآن خوانی کے بعد مرحوم کیلئے اجماعی دعا ہوئی۔ دعا کروانے والے خود مولانا تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی وہ دعا اگر محفوظ کرلی جاتی تو لوگ خود دیکھ لیتے کہ تسلیم و رضا کے معنی کیا ہیں! جی تو چاہتا ہے کہ اپنے اس مشاہدے کو خوب تفصیل سے لکھوں مگر کمزور آدمی ہوں، اتنا جگرا نہیں رکھتا۔ اس قدر بھی جو لکھا ہے، دل پتھر کرکے لکھا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر سالک کو، آلِ کار تعلق باللہ کی ایک خاص وضع عطا ہوتی ہے جس پر وہ مستقلاً کاربند رہتا ہے۔ کسی کیلئے وہ وضع نماز ہوتی ہے اور کسی کیلئے تلاوت یا ذکر یا مراقبہ وغیرہ۔ مولانا کے حصے میں دعا آئی تھی جو عبادت کا مغز ہے اور محبت کا خلاصہ۔ دعا میں بندہ اپنے ناسوتی تعین کی پوری تفصیل کے ساتھ اللہ سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے اس دنیاوی زندگی میں ہر دم برپا تغیرات مرکز گریزی کی راہ نہیں اختیار کرپاتے اور آدمی کے تمام پست و بلند ایک ہی آسمان کے زیر سایہ آجاتے ہیں۔ مجھے مولانا کو ان کے خاص

حلقۂ ذکر میں دو ایک مرتبہ محو دعا دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اللہ کی عظمت و بے نیازی اور اپنی محتاجی، ذلت اور لاچاری کا شدید احساس ہر بن مو سے پھوٹ رہا تھا مگر ساتھ ساتھ ایک روتے ہوئے بچے کے مطالبات میں جو بے تکلفی ہوتی ہے وہ بھی حرف حرف سے ٹپک رہی تھی۔ ان کا سمٹ کر سر جھکا کر بیٹھنا، ہاتھ جوڑنے کے سے انداز میں دست بدعا ہونا اور انتہائی رقت، محتاجی، اعتماد، بھولپن، لجاجت، بے تکلفی اور عاشقانہ تڑپ کے ساتھ گھٹی گھٹی آواز میں اپنے مالک کو پکارنا شرکائے دعا کو کسی اور ہی عالم میں پہنچادیتا تھا۔ وریوں ان کی پوری زندگی ہی ایک دعائیہ آہنگ میں گزری۔

دعا کے حوالے سے یاد آیا کہ نقشبندی سلوک میں تمکن کے درجے پر پہنچ کر سالک کا ذوقِ قرب کسی خاص لطیفے کا رنگ قبول کرلیتا ہے اور وہ لطیفہ جس نبی کے زیر قدم ہوتا ہے، سالک مراتبِ وصول کو اسی نبی کے مشرب پر طے کرتا رہتا ہے۔ جیسے صاحبِ قلب آدمی المشرب ہوتا ہے اور صاحبِ روح تشبیہ کا غلبہ ہو تو ابراھیمی المشرب اور تنزیہ غالب ہو تو نوحی المشرب۔ ہاشمی صاحب قبلہ گمان غالب ہے کہ آدمی المشرب تھے۔ اس مشرب میں عروج تو دیگر مشارب کے مقابلے میں کم ہے لیکن تفصیل اور وسعت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق دائرہ ظہور سے ہے۔ لطائف میں قلب کی کم وبیش وہی حیثیت ہے جو حواس باطنی میں خیال کی ہے۔ یہ لطائف کے صوری و معنوی حاصلات کا محافظ اور خزینہ دار ہے۔ یہی ہے جو دیگر لطائف کے واردات کو سالک کیلئے محسوس و معقول بناتا ہے اور انہیں نفس پر منعکس کرتا ہے۔ اس کی آنکھ مراتب خلق و امر میں وحدت فی الکثرت کے اصولی اطلاق کا مشاہدہ کرواتی ہے۔ اور ہستی کی پست ترین سطحوں میں بھی حق کی اس نسبت کا ادراک کرلیتی ہے جو ظہور ہو رہی ہے اور لامحدود تضاد و تنوع کو وجودی انتشار بننے سے روکے ہوئے ہے۔ غرض قلب اور اس سے پھوٹنے والے مشرب کے عرفانی اختصاصات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ حضرت آدم علی نبینا و علیہ السلام کی تحت قدم ہونے کی وجہ سے اس کی ولایت سے مشرف ہونے والے سالک پر فطرت مخلوقہ کی وہ اوّلین حالت منکشف ہو جاتی ہے جس میں عقل، روح اور نفس اپنے ذاتی امتیازات کے باوجود ایک سادہ اکائی کی صورت میں موجود تھے۔ روح، حق کی طرف یکسو تھی اور نفس، روح کی طرف۔ عقل ایک

جہت میں ان دونوں سے متعلق تھی اور دوسرے رخ سے حق کی ماورائے ظہور شان کی طرف متوجہ تھی۔ آدمی المشرب حضرات میں اسی متوازن کلیت کا عملی اظہار ہوتا ہے۔ اس اظہار کی کئی شکلیں ہیں جنہیں ہم اپنے ہاشمی صاحب کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ دعا کا ذکر پہلے آچکا ہے مگر اس مقام کی مناسبت سے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلب کی دو سواریاں ہیں جن میں سے ایک دعا ہے۔ دعا کا مطلب ہے اس فاعلی انفعال کی بازیافت جو تعینِ عبدیت کی اصل ہے، تاکہ افعال اللہ کے ساتھ کامل موافقت پیدا ہوجائے۔ اس کے تین مراحل ہیں۔ پہلا صبر، دوسرا شکر اور تیسرا توکل۔ قلب کا دوسرا مرکب ہے استغفار۔ استغفار کیا ہے؟ نفس اور حق کا بیک وقت استحضار! یہ تعریف ایک محدود معنی میں ہے اور اس کا اطلاق طلب مغفرت کی اس سطح پر ہرگز نہیں کیا جاسکتا جو انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے۔ مولانا کے سبھی دوست جانتے ہیں کہ وہ اٹھتے بیٹھتے جن کیفیات میں رہتے تھے ان میں ایک مستقل کیفیت استغفار کی تھی۔ انسانی زندگی اگر تعلق باللہ کے تابع ہو تو اس کی ہر آن یا تو صبر سے مملو ہوگی یا شکر سے یا استغفار سے۔ قلب جب اپنی حقیقت کو پہنچ کر وصول الی اللہ کے عناصر سہ گانہ یعنی خشیت، معرفت اور محبت سے علاقہ بیدار کرتا ہے تو اس کا عملی و زمانی اظہار انہیں تین صورتوں میں ہوتا ہے، اکثر الگ الگ اور گاہے اکٹھا۔ صبر کی نسبت معرفت سے ہے، شکر کی محبت سے اور استغفار کی خشیت سے۔ بفضلِ خدا ہاشمی صاحب قبلہ کی زندگی ان تینوں سے معمور تھی مگر طبیعت کی سادگی کے سبب کوئی رسمی و اصطلاحی اظہار نہیں پایا جاتا تھا۔

کسی بھی مسلمان کے بارے میں یہ کہنا عجیب سا لگتا ہے کہ وہ حبیب خدا شفیع روز جزا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عاشق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر مسلمان ہونے کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ تاہم اس عشق کے انداز مختلف ہوسکتے ہیں اس معاملے میں علما۔ کی اکثریت کے برعکس مولانا بالکل از خود رفتہ اور مجذوب تھے۔ یہاں وہ کسی بھی طرح کے رکھ رکھاؤ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جب بھی سرکار ختمی مرتبت ﷺ کا ذکر مبارک آتا تو

ع۔ "فدائے نقش نعلیت کنم جاں یارسول اللہ"

کی زندہ تصویر بن جاتے تھے۔ اخیر عمر میں سیرت پاک لکھنے کا شدید تقاضا پیدا ہوا جسے مؤرخ یا

محدث کے قلم سے نہیں بلکہ عاشق کے قلم سے تحریر کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ آدھا بدن فالج کے زیر اثر تھا، زبان ہلانے کیلئے بھی مشقت کرنی پڑتی تھی، پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے مگر اس محبت کے قربان جائیے کہ اپنی ناطاقتی پر مطلق نظر نہ تھی بس یہی دھن لگی تھی کہ جیسے بھی بن پڑے اس کام کا ڈول ڈال دیں۔

بوادی کہ دراں خضر را عصا خفتست
بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتست

زبان میں دل کی طاقت بھر کے بیٹے کو املا کروانا شروع کردیا۔ کچھ ورق لکھوا بھی دیئے تھے کہ غشی اور بے ہوشی کے ایام آگئے جو جان لے کر ہی ٹلے۔ ظاہر ہے کہ سیرت کی تکمیل نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیسے! ان کی حالت صاف بتاتی تھی کہ اپنے پیارے کے اسرارستان محبوبی کا کوئی ایسا بھید ان کی روح پر منکشف ہوگیا ہے کہ اظہار کا کوئی ظرف اس کی سمائی نہیں رکھتا۔ ﷺ۔

حب عشقی کا غلبہ رکھنے کی بدولت مولانا کل اہل ایمان کے مولاسیدنا وسندنا علی المرتضے کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور محبوب رب ﷺ کے نور چشم و راحت جاں، قبلہ عاشقاں حبیبنا امام حسینؓ (روحی فداہم) سے خاص الخاص نسبت رکھتے تھے۔

بزرگوں میں امام الاولیاء سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی، حضرت داتا گنج بخش، امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی اور مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی رحمہم اللہ تعالیٰ سے خصوصی تعلق خاطر رکھتے تھے۔ داتا صاحب علیہ الرحمہ سے اپنی محبت، عقیدت اور ممنونیت کا چندے اظہار کرنے کیلئے ایک کتاب "سید ہجویر" بھی تحریر فرمائی جو انشاء اللہ آنجناب کے بارے میں لکھی جانے والی تمام کتابوں سے بہتر ہے۔ خاص طور پر "کشف المحجوب" کو سمجھنے میں جتنی مدد اس کتاب سے ملتی ہے وہ اور کہیں سے نہیں ملتی۔

چند برسوں سے سلسلۂ قادریہ سے منسلک ہونے کا اشتیاق زور پکڑ گیا تھا۔ کچھ ملنے والوں سے پوچھتے بھی تھے کہ کسی اچھے قادری شیخ کو جانتے ہو تو بتاؤ! ایک لمبی تلاش کے بعد خدا نے حضرت اخوند زادہ سیف الرحمن مد ظلہ سے متعارف کروادیا۔ اخوند زادہ صاحب مبارک متعنا اللہ بفیوضہ افغانستان سے مہاجر ہو کر پاکستان تشریف لائے ہیں اور ایسے بزرگ ہیں کہ

اولیائے سابقین میں بھی ان کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔ انہیں دیکھ کر دوام حضور، اتباع سنت، محبت الہیہ، عشق رسول ﷺ، حمیت دینی اور تصرف روحانی کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے۔ اپنے خدام کو چاروں سلاسل کا تفصیلی سلوک کرواتے ہیں مگر غالب نقشبندیت کو رکھتے ہیں۔

مولانا کا آفتاب عمر غروب ہونے کو تھا کہ یہ شمسِ ولایت لاہور میں طلوع ہوا۔ اخوند زادہ صاحب، مولانا کی عیادت کو تشریف لائے تو انہوں نے سلسلۂ قادریہ میں داخل ہونے کی درخواست کی جسے جناب والا نے قبول فرما کر بیعت کرلیا۔ حالانکہ یہ چیز حضرت اقدس مدظلہ کے معمول کے خلاف تھی۔ آپ ہر طالب کو پہلے نقشبندی سلسلے میں بیعت کرتے ہیں اور اس کے تمام اسباق مکمل کروانے کے بعد چشتیہ سلسلے کی طرف آتے ہیں اور پھر قادری اذکار عطا فرماتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس شفقت و اکرام کا اظہار تھا جو قبلہ ہاشمی صاحب کیلئے ان کے دل میں تھا۔ عزیزی بلال محمد ہاشمی، مولانا کے منجھلے صاحبزادے، جو ماشاء اللہ خود بھی صاحب نسبت ہیں، اس موقع پر موجود تھے۔ ان پر اس واقعے سے یہ منکشف ہوا کہ اب رحلت کا وقت قریب آپہنچا ہے کیونکہ حضرت اخوند زادہ صاحب مبارک اپنے اس معمول کو کسی کے لئے نہیں بدلتے، آج یہ تبدیلی اللہ کی طرف سے ہوئی ہے تاکہ زندگی کی کم مہلتی کی وجہ سے مولانا قادری نسبت سے محروم نہ چلے جائیں۔ افسوس کہ یہ کشف صحیح ثابت ہو گیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں اپنے قرب کی چھاؤں میں رکھے اور اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کی حضوری میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

---